عبدِ باقی

ربِّ باقی کے دربار میں!

حضرت مولانا عبدالباقی صاحب حسامیؒ (بیڑ، مہاراشٹر)
کے سانحۂ وفات سے ملنے والے کچھ ایمانی اسباق اور مولانا کے چند
لائقِ ذکر و قابلِ تقلید اوصاف کے تذکرہ پر مشتمل تعزیتی بیان

از

حضرت مفتی سید احمد اللہ غوری صاحب قاسمی نقشبندی مجددی دامت برکاتہم
(خلیفہ مجاز محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مجددی دامت برکاتہم)

بمقام

مسجدِ عزیزیہ، زم زم فیکٹری، زم زم کالونی، شہر بیڑ، مہاراشٹر

بتاریخ: ۱۷/اکتوبر ۲۰۲۵ء، مطابق ۲۴/ربیع الثانی ۱۴۴۷ھ، بروز جمعہ

بعد خطبۂ مسنونہ!

آیت کریمہ: اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ لَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسۡتَقۡدِمُوۡنَ (سورۃ النحل: 61)

ترجمہ: جب ان کا وقتِ مقررہ آجاتا ہے تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکتے ہیں، اور نہ ہی آگے بڑھ سکتے ہیں۔

حدیث پاک:

اَلۡکَیِّسُ مَنۡ دَانَ نَفۡسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعۡدَ الۡمَوۡتِ

ترجمہ: عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کرے۔

(سنن ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم / حدیث: 2459)

عبدالباقی "باقی" کے دربار میں:

"بھائی مولانا عبدالباقی رحمۃ اللہ علیہ "باقی کے پاس چلے گئے" باقی" اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام ہے (یعنی ہمیشہ باقی رہنے والی ذات)۔ اور بندہ فانی ہے۔ باقی کو کبھی فنا نہیں ہے لیکن عبدالباقی (باقی کے بندے) کو کسی نہ کسی دن فنا ہے۔

ہر آنے والے کو جانا ہے:

مولانا کی رحلت کا سانحہ جس انداز سے پیش آیا ہے، ایسے واقعات سے عموماً لوگوں کے ذہنوں میں عجیب عجیب خیالات آنے لگتے ہیں۔ ایسے وقت ہمیں یہ بات مستحضر رہنی چاہیے کہ یہ کوئی اَن ہونی نہیں ہے۔ اس دنیا کا تو یہ بنیادی اصول ہے کہ یہاں ہر آنے والے کو ایک دن جانا ہے۔ جب سے دنیا بنی ہے تب سے یہ نظام قائم ہے اور قیامت کی صبح تک رہے گا۔

دنیا سے جدائی کے مختلف طریقے:

ہاں! البتہ جانے والے مختلف طریقوں سے جاتے ہیں۔ مثلاً: بعضے لوگوں کے جانے سے پہلے علامات ظاہر ہو جاتی ہیں، جیسے ڈاکٹر ان کے بارے میں کہہ دیتے ہیں کہ اب ان کی موت کا وقت قریب ہے، کبھی کوئی لاعلاج مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو دو دو، چار چار برس اور کبھی اس سے بھی زیادہ مدت تک بیمار رہ کر انتقال کر جاتے ہیں۔ کبھی دنیا سے رخصت ہونے والا زیادہ لمبا وقت تو

نہیں لیتا لیکن پتہ تو چل جاتا ہے کہ جانے والا ہے اور ایک جانا ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاید جانے والے کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ مولانا کی رحلت بھی اسی طرح ہوئی کہ دوسروں کو تو چھوڑیے خود مولانا کو بھی شاید خبر نہیں ہوئی ہوگی۔ گویا دنیاوی اعتبار سے ہم سب کے لئے یہ اچانک کی اطلاع ثابت ہوئی۔

اللہ کے یہاں ہر چیز طئے شدہ ہے:

لیکن کسی حادثہ کا اچانک اور یک بہ یک ہوجانا، یہ ہمارے اعتبار سے ہے۔ ورنہ تو اللہ کے علمِ ازلی کے اعتبار سے سب کچھ طئے شدہ ہے۔ اس میں انسان ہی نہیں دنیا کی ہر چیز کے بارے میں ہر بات طئے اور مقرر ہے۔ کس انسان کی پیدائش کب ہوگی؟ کہاں ہوگی؟ کس کے ہاں ہوگی؟ وہ کیا کھائے گا؟ کیا کمائے گا؟ کہاں خرچ کرے گا؟ عمر کیسے گذرے گی؟ موت کب، کہاں اور کیسے واقع ہوگی؟ یہ سب کچھ اللہ کے ہاں طئے ہے۔

انا للہ پڑھنے کی تعلیم میں ایک حکمت:

عموماً ان باتوں پر پختہ ایمان نہیں ہوتا ہے، اس لیے ہمیں

پریشانی ہوتی ہے۔ ایمان اپنی حقیقت کے ساتھ دل میں ہونا چاہیے۔انتقال کی خبرسن کر اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ (ترجمہ: ”بے شک! ہم سب اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہم سب اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں“) والی آیت کریمہ جو ہم پڑھتے ہیں، اس میں اسی بات کی تعلیم ہے۔ گویا اس میں یہ پیغام ہے کہ جانے والا تو جا چکا، لیکن جاتے جاتے یہ پیغام دے گیا کہ اب اپنا بھی انتظار کر لو کہ ایک دن تمہیں بھی جانا ہے۔

دنیا کی زندگی دراصل انتظار ہے:

بعض مشائخ سے یہ قول منقول ہے کہ ”میں اپنی موت کے وقت کے انتظار میں اپنی زندگی کی ہر گھڑی گزار رہا ہوں“ یہ دنیا کی زندگی دراصل انتظار ہے، اور جو شخص انتظار نہیں کرتا وہ غافل ہو کر وقت گزارتا ہے۔ پھر تو وہ خسارے میں ہے۔ اسی لیے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ

أَكْثِرُوا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ يَعْنِي الْمَوْتَ

(ترجمہ: ”لذتوں کا خاتمہ کر دینے والی چیز (موت) کو اکثر یاد کرو)

(سنن ترمذی/کتاب الزہد عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: باب ماجاء فی ذکر الموت، حدیث 2307)

چناں چہ اگر کسی نے صبح سے شام تک اپنی موت کو یاد نہیں کیا تو اس کی غفلت کے لیے اتنی ہی بات کافی ہے۔

پروانۂ موت کبھی بھی آسکتا ہے:

پھر مولانا کی جس انداز سے رحلت ہوئی ہے، اس سے تو یہ سبق ہم سب کو تازہ ہوجانا چاہیے کہ ہمارا پروانۂ موت کبھی بھی آ سکتا ہے۔ ہم میں سے کس کو پتہ تھا کہ مولانا نمازِ جمعہ ادا کریں گے اور عصر کی نماز میں نہیں رہیں گے؟

سببِ ظاہری کے بغیر بھی موت واقع ہوسکتی ہے:

ایسے موقعوں پر بہت سے لوگوں کے ذہن میں خیال آتا ہے اور کچھ لوگ تو زبان سے کہہ بھی دیتے ہیں کہ یوں اچانک کیسے موت ہوگئی؟ کیا کوئی بیماری تھی، جو مولانا نے سب سے چھپائی تھی؟ کچھ تو تھا ہوگا وغیرہ وغیرہ؟ یاد رکھیں کہ اس طرح کے خیالات بالکل بھی ذہن میں نہیں آنے چاہییے، نہ ہی اس طرح کے جملے زبان پر آنے چاہییے، اس لئے کہ ہمارے اس طرح کے خیالات

اور اس نوع کی باتیں گویا اللہ کو یہ پیغام دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی سبب کے بھی موت دے سکتے ہیں، اس پر ہمارا ایمان نہیں ہے۔ یاد رکھیں کہ موت کے لیے کوئی سبب نہیں چاہیے کہ سبب پایا جائے تو موت آئے گی۔ ایسا ہرگز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سبب موت کو نہیں بلاتا ہے بلکہ موت سبب کو بلاتی ہے۔ موت جب آنی ہے، اسی وقت واقع ہوتی ہے، ہاں کبھی سبب کے طور پر بیماری میں ابتلا ہوتا ہے اور کبھی کوئی اور چیز سبب بن جاتی ہے اور کبھی بے سبب بھی موت آجاتی ہے۔ اس پر ہم سب کو پختہ یقین رکھنا چاہیے۔

ایک غلط رجحان:

ایک غلط خیال یہ بھی ذہنوں میں بیٹھا رہتا ہے کہ ہم لوگوں کی صحت، ان کے کام، ان کی ذمہ داریوں یا ان کی خدمات کے اعتبار سے ان کی مدتِ عمر کے بارے میں ذہنی اندازے قائم کر لیتے ہیں۔ پھر جب اس خیالی مدت سے بھی پہلے انتقال ہو جاتا ہے، مثلاً کسی کا چالیس سال کی عمر میں ہی انتقال ہو گیا یا پچاس سال کی عمر میں انتقال ہو گیا تو کہنے لگتے ہیں کہ بہت جلدی چلے گئے، حالانکہ

صحت مند بھی تھے، تندرست وتوانا بھی تھے وغیرہ وغیرہ۔ظاہر سی بات ہے کہ یہ اللہ پر ایمان کے منافی خیالات ہیں۔ہم اس بچے کے بارے میں کیا کہیں گے جو ماں کے پیٹ میں نو مہینے تک پرورش پاتا رہا، ڈاکٹرز نے طبی معاینوں کے ذریعے سے اس کی صحت کی تصدیق کی، اس کا جسم بھی، دل و دماغ بھی اور سارے اعضاء بھی مکمل تیار ہو گئے لیکن جب ماں کے پیٹ سے باہر نکلا تو اس حال میں کہ اس میں زندگی کے آثار نہیں تھے۔اس کے حق میں اتنا ہی مقدر تھا۔یہ تو ہمارے اپنے بنائے ہوئے ذہنی معیارات ہوتے ہیں، جو بالکل غلط اور ایمان کے منافی ہوتے ہیں۔

اسی لیے ہمارے مشائخ نے ہمیں ایک بات یہ بھی سمجھائی ہے کہ دنیاوی زندگی کی مدت تو دونوں کانوں میں دی جانے والی اذان و اقامت کے درمیانی فاصلے کے برابر سمجھنا چاہیے۔یعنی ہماری پیدائش کے وقت ایک کان میں اذان اور دوسرے کان میں اقامت جو دی گئی ہے، اس کے درمیان کا جو وقت ہے، یوں سمجھنا

چاہیے کہ بس وہی وقت ہماری زندگی کا ہے۔

مشائخ نے ایک بات یہ بھی ارشاد فرمائی کہ "چالیس سال کی عمر ہوگئی تو یوں سمجھو کہ زندگی کی عصر ہوگئی ہے۔ اب عصر سے مغرب کے درمیان جتنا وقت ہے، زندگی کا اتنا ہی وقت بچا ہے، باقی وقت تو بیت چکا ہے۔

ہمارے اہلِ تعلق میں ایک مفتی صاحب ہیں، ان کے لڑکے نے جمعہ کے دن جمعہ کی نماز ادا کی اور بالکل ٹھیک ٹھاک تھا لیکن اچانک سے بس ایکسیڈنٹ ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بچہ منٹوں میں ختم ہوگیا۔ لہذا یہ بات ذہن میں ہمیشہ مستحضر رہنی چاہیے کہ موت کسی بھی عمر میں اور کسی بھی وقت آسکتی ہے۔

عمر کے ساتھ خدمات و کام بھی عند اللہ متعین ہیں:

اسی طرح ایسے موقعوں پر سننے میں آتا ہے کہ "ادھورے کام چھوڑ کر چلے گئے، عمر نے وفا نہیں کی" یہ کہنا اور اس طرح سوچنا بھی غلط ہے۔ یاد رکھیں کہ اللہ نے جس کی جتنی عمر لکھی تھی، اتنے ہی کام اس کے مقدر میں تھے۔ تو مولانا نے جتنے کام کئے ہیں، وہ اپنے

مقدر کے پورے کام کر کے اللہ کے حضور پہونچے ہیں۔ مثلا: مدرسہ مبلغ الاسلام کی نئی عمارت تعمیر ہوئی ہے تو اللہ نے ان کے مقدر میں اتنا ہی لکھا تھا۔ اب آگے کا کام بعد والوں کا مقدر ہے۔

تفسیرِ جلالین شریف کی تصنیف کا قصہ:

ہمارے ہاں مدارس میں تفسیرِ قرآنِ پاک کی ایک کتاب "جلالین شریف" پڑھائی جاتی ہے۔ یہ دو علماء کرام نے مل کر لکھی ہے، ان میں ایک استاذ تھے اور دوسرے ان کے شاگرد۔ اور چوں کہ دونوں کا نام جلال الدین تھا، اسی لیے اس کی مناسبت سے کتاب کا نام ہے "جلالین"۔

استاذ ہیں "جلال الدین محلّی رحمۃ اللہ علیہ"۔ انہوں نے تفسیرِ جلالین کی ابتداء کی اور پہلے سورۂ کہف سے لے کر آخرِ قرآن تک تفسیر لکھی اور پھر اس کے بعد سورۂ فاتحہ کی تفسیر لکھی۔ اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا تو ان کے شاگرد "جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ" نے اپنے استاذ "جلال الدین محلّی" کے انداز پر بقیہ تفسیر کو مکمل کیا، یعنی سورۂ بقرہ سے سورۂ اسراء تک کی تفسیر لکھی۔ تو جس کے حق میں جتنا مقدر تھا،

انہوں نے اتنا ہی کام کیا۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ جلال الدین محلی رحمۃ اللہ علیہ نے آدھے قرآن کی تفسیر لکھی اور ادھوری چھوڑ کر چلے گئے، کاش کہ وہ زندہ رہتے اور پورے قرآنِ کریم کی تفسیر لکھ دیتے تو گویا اس کا مطلب ہوا کہ ہمارے اعتبار سے کام کے مکمل ہونے تک کام کرنے والے کا زندہ رہنا کوئی طے شدہ بات تھی، کہ اس کے خلاف ہوگیا۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ اس طرح کہنا یا سمجھنا انتہائی غلط ہے۔ جنہوں نے آدھے قرآن کریم کی تفسیر لکھی تو ان کے مقدر میں اتنا ہی لکھنا تھا اور بقیہ آدھے حصے کی تفسیر لکھنا دوسرے کے مقدر میں تھا۔ اس لئے ذہن میں ہمیشہ یہ بات رہنی چاہیے کہ کوئی اپنے وقت سے پہلے نہیں جاتا اور نہ کوئی اپنا کام ادھورا چھوڑ کر جاتا ہے۔ جو کام جس قدر جس کے مقدر میں ہوتے ہیں وہ کر کے ہی دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ایک سبق:

خود نبی علیہ السلام کی سیرت میں دیکھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ابھی بطنِ مادر میں ہی تھے کہ آپ کے والد کا سایہ سر سے اٹھ چکا، تو

حضرت عبداللہ کا کام گویا اتنا ہی تھا کہ وہ امام الانبیاء کے دنیا میں آنے کا ذریعہ بنے اور بس، اس کے آگے ان کے فرزند، جن کی شان اگلے وقت میں یہ ہونی والی ہے کہ وہ امام الانبیاء اور فخرِ رُسُل بننے والے ہیں، ان کا دیدار حضرت عبداللہ کے مقدر میں نہیں تھا۔

حاکم و حکیم کا مراقبہ:

ایسے موقع پر ہمارے مشائخ نے ایک مراقبہ سکھایا یعنی ایک سوچ و فکر تجویز فرمائی کہ اللہ کے دو صفاتی نام ہیں؛ ایک حاکم اور ایک حکیم۔ حاکم کا مطلب یہ ہے کہ ایسی ذات جو اپنی مرضی سے جو چاہے فیصلہ کرے اور حکیم کہتے ہیں اس کو جو اپنے فیصلوں میں مثبت و منفی تمام پہلوؤں کو سامنے رکھے۔ تو اللہ تعالیٰ حاکم بھی ہیں اور حکیم بھی ہیں۔ مولانا کی رحلت یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور ان کی شان حاکمیت کا ظہور ہے اور ان کے اس انداز سے دنیا سے رخصت ہونے کے پیچھے کیا کیا حکمتیں ہیں، اس کے اثرات و نتائج کیا ہوں گے اور انجام و عواقب کیا ہوں گے؟ یہ سب ان کے علم میں ہے اور ان تمام پہلوؤں پر نگاہ کے ساتھ انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے،

یہ ان کی حکیمی کا پہلو ہے۔ چوں کہ اللہ کی حکمت کے پہلو ہماری کم فہمی و عاجزی، کمزوری و بے بسی کی وجہ سے نگاہوں کے سامنے نہیں ہوتے، اس لیے ہمارے ذہنوں میں ایسے موقعوں پر منفی خیالات آتے ہیں۔ اس لیے اس سے بچنا چاہیے۔

مرنے والوں کی خوبیاں بیان کرنا چاہیے:

نبی علیہ السلام کی ایک حدیثِ مبارک ہے، ارشاد فرمایا:

اُذْکُرُوا مَحَاسِنَ مَوْتَاکُمْ (ترجمہ: اپنے جانے والوں کی خوبیاں بیان کرو) سنن ترمذی/ کتاب الجنائز عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم/ حدیث 1019

چنانچہ اتباعِ سنت کی نیت سے مولانا کی چند خوبیاں، جو عاجز کے ذہن میں ہیں، بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

مولانا میں صبر بہت تھا:

چوں کہ مولانا اس عاجز سے وابستہ تھے، (سلوک کی راہ میں) اس لیے عرض کر رہا ہے کہ ان میں صبر و تحمل بہت تھا۔ اب یہ تو بتا نہیں سکتا کہ کہاں کہاں یہ دیکھا ہے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ان کے اندر صبر بہت تھا۔ اور صبر بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔ یوں تو حکم یہ

ہے کہ صبر مانگنا نہیں چاہیے لیکن جس کو اللہ تعالیٰ صبر کی نعمت سے سرفراز فرماتے ہیں، اس کو سمجھنا چاہیے کہ یہ بِن مانگے کی نعمت ہے۔ صابر بندے کو اللہ تعالیٰ بہت سے شرور وفتن سے بچا لیتے ہیں، اگر کسی کے اندر صبر نہ ہو تو پھر کبھی مشتعل ہو جاتا ہے، کبھی اس کی زبان بے لگام ہو جاتی ہے اور کبھی ہاتھ پاؤں بھی چلنے لگتے ہیں۔

مشورے کے بغیر کام نہیں کرتے تھے:

اسی طرح ایک دوسری خوبی مولانا کے اندر یہ دیکھی کہ ہر ضروری کام کے سلسلے میں مشورہ کرتے تھے، بغیر پوچھے قدم آگے نہیں بڑھاتے تھے۔ کبھی کبھار تو صرف جمعہ پڑھنے کے لئے اورنگ آباد آجاتے اور ملاقات کر کے دو چار منٹ میں مشورہ کر کے رخصت ہو جاتے۔

صاف دلی:

تیسری چیز جو دیکھی وہ یہ کہ ان میں صاف دلی بہت تھی، کچھ کہنا سننا بھی ہو گیا تو ان کے دل میں اس کا اثر نہیں رہتا تھا۔

مہمان نوازی:

اور چوتھی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مہمان نواز تھے۔ان کی دلی تمنا رہتی تھی کہ اس راستے سے جب کبھی گذر ہوتو ضروران کے یہاں رکیں۔شروع شروع میں رمضان المبارک کے عشرۂ اخیرہ کے اعتکافِ مسنون کے بعد عید کی رات جب واپسی ہوتی تو عموماً عشاء کی نماز اور عشائیہ ان کے یہاں ہی ہوتے۔پھر سفر کا اگلا مرحلہ رہتا۔

غفلت نہیں تھی:

ان سب کے ساتھ ان کی خاص خوبی، جو اہم و بنیادی ہے اور قابل تقلید بھی کہ اس عاجز نے ان کو کبھی غافل نہیں دیکھا۔عاجز کا مزاج نہیں ہے کہ کسی کے بارے میں بتاتے ہوئے مبالغہ سے کام لے، ہوسکتا ہے کہ وہ معمولات میں کمزور رہے ہوں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بہ حیثیت سالکِ طریقت وہ مکمل سو فیصد جیسا چلنا چاہیے ویسے نہ رہے ہوں، لیکن یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ وہ

بے کار نہیں بیٹھتے تھے۔ مسلسل مصروف رہتے تھے۔ کسی نہ کسی کام کے بارے میں مشورہ کرتے رہتے تھے، ان کے اندر خدمتِ دین کا بہت جذبہ تھا۔ راہِ سلوک میں یکسوئی کی بڑی اہمیت ہے، اس سے بہت جلدی انسان کو کامیابی ملتی ہے، تو اس لحاظ سے ان کو روکا بھی جاتا تھا لیکن ان کی فکریں کبھی ختم نہیں ہوتی تھیں۔ وہ وقت کے تقاضوں اور امت کی ضرورتوں کی تفصیل رکھ کر منوا لیتے تھے، پھر یہ عاجز بھی کہہ دیتا کہ آپ جو مناسب سمجھ رہے ہیں کریں۔

مکاتب کے استحکام و توسیع کی فکرمندی:

ان کی بہت سی دینی خدمات ہیں، خصوصاً امت کے نونہالوں اور اگلی نسلوں کے ایمان کی فکر بہت تھی، اس لیے مکاتب کے استحکام اور اس کے نظام کی توسیع کے لیے مستقل لگے رہتے تھے۔ وہ بچوں کی نفسیات شناس تھے، بچوں کو کیسے پڑھانا ہے، اور ان کو کیسے آگے بڑھانا ہے، وہ اچھے سے جانتے تھے اور ان امور کو وہ مکاتب کے معلمین میں منتقل بھی کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے گاہے بہ گاہے ان کے لئے تربیتی ورک شاپ بھی منعقد کیا کرتے

تھے۔

ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ مکتب کے معلمین کو جمع کر رہا ہوں اور آپ آڈیو میسج کے ذریعہ ہی دو چار کلمات ارسال فرمائیں تو میٹنگ میں سب کو سنانا چاہتا ہوں۔ ان کے اندر جو تڑپ تھی، وہ اس عاجز کو مجبور کر دیتی تھی۔ چناں چہ دو چار جملے، اللہ کی توفیق سے لکھ کر ان کو بھیج دیا۔

صرف انبیاء معصوم ہیں اور صحابہ مغفور:

باقی گروہِ انسانیت میں انبیاء کرام کی ہستیاں ہی معصوم ہیں اور بس۔ خامیوں، لغزشوں اور کوتاہیوں سے ان کے سوا کوئی خالی نہیں۔ ہاں! حضراتِ صحابۂ کرام سے کچھ خطائیں سرزد بھی ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما کر ان کی مغفرت فرمادی۔

عام مومنین کے ساتھ حسنِ ظن رکھنا چاہیے:

ان دونوں مقدس گروہوں کے سوا کوئی بھی غلطیوں سے پاک نہیں۔ لیکن ہمارے لئے حکم یہ ہے کہ ہر مومن کے ساتھ حسنِ ظن رکھیں کہ ان شاء اللہ اللہ پاک مغفرت فرمائیں گے۔

اس عاجز کا رجحان:

اس عاجز کا رجحان تو یہ ہے کہ جس کو اللہ پاک مرتے دم تک اپنے دین کی کسی نہ کسی خدمت کی توفیق عطا فرمائیں، تو امید ہے کہ اس کی برکت سے اس کی مغفرت فرمادیں گے۔

جمعہ کے دن رحلت پر بشارتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مولانا کی رحلت جمعہ کے دن ہوئی ہے اور جمعہ کی نماز کے بعد، بعضے روایات میں ہے کہ جس مسلمان شخص کا جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات کو انتقال ہوجائے تو وہ قبر کے فتنہ و آزمائش سے اور حساب و کتاب سے محفوظ رہتا ہے اور وہ شہید لکھا جاتا ہے۔

(مصنف ابن عبد الرزاق، کتاب الجمعۃ، باب من مات یوم الجمعۃ، ج۔3۔ص۔550)

اس اعتبار سے ہمیں اللہ کی رحمت سے مرحوم کی مغفرت کی امید رکھنی چاہیے۔ اس موقع پر مولانا کے رشتہ دار، بھائیوں اور دیگر افرادِ خاندان خاص طور پر مولانا کے افرادِ خانہ اور اولاد کی خدمت میں تعزیتی کلمات پیش ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے، اپنے قرب کے اعلی درجات عطا فرمائے اور ہم سب کو بھی اپنی رضامندی والی زندگی گذارنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)